اخلاقی تربیّت میں معرفت اور رجحان کا تعامل

مقدر عباس[۱]

خلاصہ

انسان ایک ایسی خود مختار مخلوق کا نام ہے جو کمال کی تلاش میں ہے۔ خود مختاری کے بغیر انسان اعلیٰ اہداف کو حاصل نہیں کر پاتا۔ لیکن خود مختاری بذات خود، معرفت، رجحان اور قدرت کے تین عناصر پر مشتمل ہے۔ انسان کے ارادی واختیاری کام رجحان اور شناخت و آگاہی کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہوتے۔ اس پسِ منظر میں اس مقالے کا سوال یہ ہے کہ آیا انسانی رجحانات کا محرک فقط معرفت و شناخت ہے یا معرفت و شناخت کے ساتھ تمایلات و رجحانات اور عواطف بھی عوامل ہیں؟ اس تحقیق کے نتیجہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ انسان کی اخلاقی تربیت کے لئے صرف معرفت کافی نہیں ہے بلکہ معرفت اور رجحان کا باہمی تعامل ہے۔ انسانی کردار و رفتار میں دونوں اہم کردار کی حامل ہیں۔

کلیدی الفاظ: اخلاقی تربیت، اخلاقی رویّے، رجحان، معرفت۔ عواطف

---

[۱]۔ پی ایچ ڈی طالب علم جامعہ المصطفیٰ العالمیہ

تاریخ وصول: ۱۵/۲/۲۰۲۲
تاریخ تائید: ۲۰/۷/۲۰۲۲

مقدّمہ

انسان کی جسمانی اور عقلی تربیت کے ساتھ ساتھ اس کی اخلاقی تربیت کے بھی مختلف مراحل ہیں۔ یہ ایک لمبے عرصے پر محیط، طویل سرگرمی ہے۔ انسانی صلاحیتوں اور قابلیتوں میں فرق کی وجہ سے ماہرینِ نفسیات کی آراء بھی مختلف ہیں۔ معاشرتی، اقتصادی، ثقافتی و تہذیبی اختلافات بھی انسان کی تربیت اور رُشد پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام نے ہر تربیتی مرحلے کی کے مخصوص تربیتی احکامات بیان کئے ہیں۔ معصومین علیہم السلام کی احادیث مختلف مراحلِ زندگی کے مختلف احکامات کا تعین کرتی ہیں۔ تربیت کے بعض مراحل کی طرف حضرت علی علیہ السلام نے رہنمائی فرمائی ہے: "سات سال بچے کی پرورش کی جائے، اگلے سات سال ادب، پھر سات سال اس سے خدمت کروائی جائے، قد کی بڑھوتری تیئیس سال اور عقلی تکامل کی عمر پینتیس سال ہے اور اس کے بعد تجربات کا حصول۔ "[1] اسی طرح آپؑ اپنے فرزند امام حسنؑ کو یوں نصیحت فرماتے ہیں: "کم سن کا دل اس خالی زمین کی مانند ہوتا ہے کہ جس میں جو بیج ڈالا جاتا ہے اسے قبول کر لیتی ہے۔ للذا میں نے چاہا کہ تمہیں دل کے سخت ہونے اور عقل کے مشغول ہو جانے سے پہلے وصیت کر دوں۔ "[2]

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اخلاقی تربیت کے مربی کو انسانی وجود میں پیش آنے والے نشیب و فراز کا علم ہونا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ اس کے لئے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ انسانی افعال کا سرچشمہ کیا ہے؟ بعض محققین علم و معرفت اور شناخت کو قرار دیتا ہے تو کوئی انسانی تمایلات، رجحانات اور رغبتوں کو۔ لیکن یہ عین ممکن ہے کہ کسی ایک معیار کو مطلق ترجیح نہ دی جاسکے۔ کیونکہ انسان کی شناخت، رجحانات اور افعال کو اگر اس کی زندگی کے مختلف مراحل اور صنف کے تناظر میں دیکھا جائے تو بحث کے نتائج مختلف ہوں گے۔ بچپن میں انسان ہر چیز کو جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کب سے ہے؟ کب تک ہے؟ کس کے لئے ہے؟ وغیرہ جیسے سوالات۔ یہ سوالات انسانی فطرت کی عکّاسی کرتے ہیں۔ انسان اپنی فطرت میں معرفت کا متلاشی ہے۔ لیکن یہ تلاش بذات خود ایک رجحان اور رغبت ہے جو معرفت کے حصول کا زینہ ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خود معرفت کی تلاش کے رجحان کا سرچشمہ کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ یہاں پر اس کا سرچشمہ خود اجمالی معرفت ہے۔ اور یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ رجحان اور معرفت ہر دو باہم استعمال ہو رہے ہیں اور ان میں کوئی عمودی ترتیب نہیں پائی جاتی بلکہ یہ دونوں عرضی ترتیب میں ہیں۔

میل و رجحان معرفت کو مضبوط کرتی ہے اور معرفت رجحان اور رغبت کو پروان چڑھاتی ہے۔ بچپن جو بادشاہت اور تکریم کا زمانہ ہے، اس میں بیشتر غریزہ اور رجحان کا عمل دخل ہے لیکن اس میں اگر انسان کا مربی ایک عملی نمونہ ہو تو وہ اسے درست سمت فراہم کر سکتا ہے۔ یعنی اس انداز میں وہ امور کو منظّم کرے کہ بچے کو محسوس ہو کہ وہی ہو رہا ہے جو میری خواہش ہے لیکن ساتھ وہ کمال کی جانب ارتقائی مراحل کو بھی طے کر رہا ہو۔ بچپن کے بعد نوجوانی کا مرحلہ، اطاعت کا مرحلہ ہے جس میں انسان اپنے مربی، معلم اور ماں باپ کو ایک دلسوز اور مہربان کی نگاہ سے جاننے لگتا ہے۔ اگرچہ اس عمر کا تعین کرنا ایک مشکل امر ہے لیکن تقریباً سات سے چودہ سال کا یہ سفر چیزوں کو سیکھنے، معلومات کی جانچ پڑتال اور قوانین کو جاننے کی جانب ایک قدم ہے۔ یہ مرحلہ اطاعت محور ہے۔ متربی خود

آمادگی ظاہر کرتا ہے اور تربیت کے لئے اپنے آپ کو معلم کے حوالے کر دیتا ہے۔ اچھے برے اور مطلوب و منفور کے درمیان فرق سمجھنے لگتا ہے۔ یہی وہ عمر ہے جس میں انسان زندگی کے بنیادی اصول، تعاون و بھائی چارگی، خوبیوں اور اخلاق حسنہ کی طرف رغبت اور اخلاق رذیلہ سے دوری اور بیزاری سیکھتا ہے۔ اس کے بعد وزارت کا زمانہ ہے جس میں وہ مشیر ہے۔ اس سے مشورہ طلب کرنا ہے۔ اسے اعتماد میں لینا کہ تمہاری اہمیت ہے۔ اب ذمہ داری اٹھانی ہے اور تم کر سکتے ہو۔ جسمانی قوت اپنے عروج پر، ہوش و حواس اور شناخت کی مختلف راہیں اور اپنے گزشتہ تفکرات کی تحلیل کا زمانہ ہے۔ یہاں خود مختاری کا احساس پایا جاتا ہے۔ عمر کے اس حصے میں مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب جوان کو اخلاقی تربیت اور فکری غذا صحیح اور کامل فراہم نہ کی جائے۔ جب اس کے سوالات کو کم اہمیت دی جائے اور اس کو تسلی بخش اور اطمینان بخش جواب نہ دیا جائے۔ اگر اسے درست راستہ نہ دکھایا جائے تو اس کی قوتیں انحراف کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ۴

تربیت اخلاقی میں آخری مرحلہ ''بزرگی'' ہے۔ اسے مرحلۂ حمایت کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ زمانہ معرفت و شناخت، رجحان ور غبت اور رفتار و کردار میں کمال کا درجہ رکھتا ہے۔ اس عمر کے افراد کو تدریس، تربیت، مدیریت اور اہم فیصلہ جات میں مشاور کی حیثیت سے ذمہ داریاں سونپنا مفید ثابت ہو گا۔ انسان شناسی میں ہم اس بات سے آشنا ہوتے ہیں کہ انسان تین جہات یعنی معرفت و شناخت، رجحان ور غبت، اور توانائی کا حامل ہے۔ یہی انسانی افعال کا اصلی عامل ہیں۔ انسان فاعلِ خود مختار ہے۔ بلند اہداف کے حصول کے لئے کوشاں ہے۵۔ اکثر افعال آگاہی اور انتخاب پر مبنی ہیں۔ چاہے ان افعال کا تعلق ظاہری اعضاء سے ہو یا باطن سے۔ یہ تمام امور اسکی معرفت اور شناخت پر مبنی ہوتے ہیں۔ پس فعل اختیاری وہ فعل ہے کہ فاعل کی چاہت کے مطابق ہو۔ اور بلند ہدف کو پا لینے کی خاطر اس کے عوامل میں رجحان ور غبت کا بھی عمل دخل ہو۔ کیونکہ جہاں فاعل خود مختار نہیں اور بلند ہدف کا حصول، باعث رغبت نہ ہو وہاں انسان کام کرنے میں دلچسپی ظاہر نہیں کرتا۔ پس ہر انسانی فعل کی بنیاد شناخت اور رجحان ور غبت ہے۔

انسانی اعمال بھی بعض اوقات معرفت اور رجحانات کی افزایش کا سبب بنتے ہیں۔ ۵اسی طرح بعض رجحانات ظاہری ہوں یا باطنی، وہ بھی انسان کے اعمال و معرفت کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر، ماں دنیا و مافیہاکے آوازیں سن کر بھی نیند جاری رکھتی ہے، لیکن جونہی بچے کی رونے کی آواز آتی ہے۔ نیند سے بیدار ہو جاتی ہے۔ یہاں پر ماں کے رجحانات اعمال ور فتار میں اثرانداز واقع ہوتے ہیں۶۔ انسانی تخیل میں وہی چیزیں یاد رہتی ہیں جن میں رغبت ہو اور وہ چیزیں محو ہو جاتی ہیں جس سے انسان بیزار ہوتا ہے۔ لہٰذا اس ترتیب سے ان کے درمیان تعاملی صورت حال ہے۔ اتنے متصل ہیں کہ جدائی ناممکن ہے۔ انسان کی تربیت اخلاقی میں ابتدائی مرحلہ شناخت کا مرحلہ ہے، پھر میل ور غبت۔ ارادہ و اختیار کے لئے شناخت اور رجحان ور غبت دو بنیادی عناصر ہیں۔ کوئی بھی ارادی اور اختیاری کام شناخت اور رجحان ور غبت کے بغیر پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ پس مولا علی علیہ السلام کے اس فرمان کے ذیل میں جو آپ نے کمیلؓ سے فرمایا:؛ کوئی کام بھی ایسا نہیں ہے کہ جس میں آپ معرفت کے محتاج نہ ہوں۷۔ کیونکہ انسان فطرتاً معرفت کی تلاش میں ہے۔

بیانِ مسئلہ

دنیا کے تمام مکاتب،انسانی معاشرے میں اخلاق کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ اخلاق کے بغیر اجتماعی زندگی ممکن نہیں ہے۔اگر اخلاق کو زندگی سے نکال دیا جائے تو بشریت کے لئے امنیت ایک خواب بن کے رہ جاتی ہے۔اسی لیے تمام مکاتب کی خواہش یہی ہے کہ پسندیدہ، معقول اور مقبول بنیادوں کو اخلاق کے لئے متعارف کرائیں۔ البتہ حقیقت یہی ہے کہ کوئی بھی الحادی مکتب،اخلاق کی بنیادیں فراہم نہیں کر سکا۔کیا صرف انسان کا علم و معرفت اسے خوبی وبدی،اچھے کام کرنے کی ترغیب اور برے کام اور بداخلاقی سے رکنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔؟اگر موثر ہے تو کیا آگاہی و شناخت،انسان کے کردار کو سنوارنے میں شرطِ کافی ہے؟یا دیگر بھی کوئی قوت درکار ہے۔؟جس کی بنیاد پر انسان کا کردار نمایاں ہوگا۔اس سوال کے مختلف مکاتب نے جوابات بھی دیے اور اُن کی طرف سے عقلی و تجربی دلائل بھی پیش کئے گئے ہیں۔ان میں سے ہر ایک کی پیش کی گئی تربیت اخلاقی بھی مختلف ہے۔ضروری ہے کہ سب سے پہلے اس سوال کا جواب تلاش کیا جائے۔

ہر عمل کی بنیاد ایک نظریے پر ہوتی ہے اور ہر نظریے کی بنیاد کائنات شناسی وانسان شناسی پر ہے۔اور ہر کائنات شناسی اور انسان شناسی کی بنیاد معرفت و شناخت پر ہوتی ہے۔اگر ہم نے نظام سازی کرنی ہے تو جس ہستی کے لیے اس نظام کو بنا رہے ہیں اس ہستی کی شناخت کا ہونا ضروری ہے۔نظام سازی میں اس چیز کا بہت عمل دخل ہے کہ نظام بنانے والے اس دنیا اور انسان کو کس نظر سے دیکھتے ہیں وہ جب بھی نظام بنائیں گے اسی فکر کے تناظر میں بنائیں گے۔

(الف) اگر وہ اس جہان اور انسان کو فقط مادی خیال کرتے ہیں تو فقط مادی نگاہ سے نظام تشکیل دیں گے۔ (ب) اگر ان کو مادہ سے ماوراء سمجھتے ہیں تو فقط معنوی پہلو کو ترجیح دیں گے اور اصلا مادہ کو زیر بحث نہیں لائیں گے۔ (ج) اگر مادہ کو اصل قرار دیں گے اور روح و معنویت کو ایک ثانوی حیثیت دیں گے تو ان کا ہدفِ اصلی مادیت ہوگا اور اس کے لئے معنویت کو قربان کر دیں گے (د) اگر اصل روح و معنویت کو قرار دیں گے اور مادہ کی اہمیت سے بھی انکار نہیں ہوگا تو ایک ایسا نظام تشکیل دیں گے کہ جس میں روح ومادہ دونوں کو اہمیت دی جائیگی مگر معنویت کو اصالت حاصل ہوگی۔[۸] یعنی جب ان میں سے کسی ایک کو قربان کرنے کا وقت آئے گا تو مادیت کو قربان کر دیں گے اور جس کو بقا حاصل ہے اس کو بچالیں گے۔یعنی اقدار کو بچائیں گے چاہے اپنے مادی وجود کے ٹکڑے ہو جائیں۔اور جو اس نظریے کا حامل ہو وہی بر حق ہے اور وہی یہ نعرہ لگا سکتا ہے کہ میں گردن تو کٹوا سکتا ہوں مگر باطل کے سامنے سر نہیں جھکا سکتا۔

اس تحقیق میں سوال اصلی یہ ہے کہ: کیا دینی واخلاقی تربیت میں فقط معرفت اور شناخت ہی کافی ہے۔؟انسان کو کمال تک لے جانے میں صرف معرفت و شناخت کا ہی کردار ہے.؟ یا اس کے ساتھ کچھ اور عوامل بھی ہیں۔؟انسان شناسی میں ہم اس نقطے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں کہ انسان مختلف الابعاد ہے،اس کی کئی جہات اور پہلو ہیں۔یعنی بُعد جسمانی کیساتھ ساتھ ایک ایسے گوہر سے بھی مزین ہے کہ جو غیر مادی (مجرّد) ہے۔جسے نفس یا روح کہتے ہیں۔یعنی اگر ایک اور انداز میں دیکھیں تو نفسِ انسانی مختلف جلوے

رکھتا ہے۔ جیسے عقل، فطرت، ہوائے نفس، ارادہ ومیلانات واحساسات و عواطف[9]۔

مفاہیم شناسی

اخلاق، خَلق کے معنی ظاہری شکل وصورت، جس کو ظاہری نگاہوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اور خُلق کا معنیٰ قویٰ باطنہ اور وہ عادات و خصائل ہیں کہ جن کا تعلق بصیرت سے ہے۔[10]"خلق" مادہ "خلقت" سے ہے۔ یعنی وہ صفات جوانسان سے جدا نہ ہو سکیں۔[11]اخلاق جمع ہے خُلق اور خُلُق کی اور لغت میں انسان کی ایسی باطنی کیفیت کہ جسے وہ کام کرتے ہوئے مشکل محسوس نہ ہو اور آسانی سے وہ کام سرانجام دے لے۔ اچھے کام میں یہ صفت پیدا ہو تو اخلاق حسنہ اور برے کام میں یہ صفت پیدا ہو تو اسے اخلاقِ رذیلہ کہتے ہیں۔ ایک دو دفعہ سرانجام دینے کو خُلق نہیں کہا جاتا بلکہ وہ کام جو طبیعت کا حصّہ بن جائے۔ اب وہ اچھا اخلاق بھی ہو سکتا ہے اور برا بھی۔[12]

تربیت کی اصل رب یعنی مالک و سرپرست یا "ربو" بمفہوم زیادتی، رشد، نمو، نگہداری، غذا دینا اور پرورش کرنا۔ اصطلاحی طور پر تربیت، پرورش جسمی وروحی ومعنوی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تربیت اگر "ربب" سے ہو تو اس کے معانی انسان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھانا، نواقص کو دور کرنا اور ہدایت کرنا تاکہ حد کمال تک جا پہنچے جو کہ مطلوب ہے۔[13]دوسرے معنوں میں انسان کو کمال تک پہنچانے کیلئے اس کو جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے فراہم کرنا۔ اور جو یہ فراہم کرے اسے رب کہا جاتا ہے۔ قرآن میں جہاں بھی رب کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ تربیت کنندہ کے لئے ہے۔ یعنی تمام مخلوقات کو اور بالخصوص انسان کو کمال تک پہنچانے کے لیے ان کی تمام ضروریات کو پورا کرنے والی ہستی کو رب کہا جاتا ہے۔ تربیت کنندہ۔ پرورش کنندہ۔ اور بطور مطلق فقط خداوند متعال کے لیے ہے۔ استاد مصباح یزدی کے مطابق انسان کی ذہنی مدیریت کو تعلیم اور انسان کی قلبی و ارادی مدیریت کو تربیت کہتے ہیں۔ یعنی انسان کی صلاحیتوں کو چاہے وہ ذہنی ہوں، حسی ہوں، حرکتی ہوں یا کردار کے حوالے سے ہوں ان کو کمال تک پہنچانا۔ پس ہدف اول انسان سالم، ہدف دوم انسان سالک، سوم انسان صالح وہدف اصلی انسانِ کامل۔[14]جدید دنیا، آئیڈیالوجی اور مکاتب کی دنیا ہے۔ آئیڈیالوجی اور مکاتب کی بنیاد جہان بینی پر ہے پس جو اس جہان کو جس نگاہ سے دیکھے گا اسی کی بنیاد پر اپنی آئیڈیالوجی تشکیل دے گا۔ اور اُسی آئیڈیالوجی کے ذیل میں اپنے نظام درست کرے گا۔ سب سے اہم یہ ہے کہ جہان بینی کی بنیاد شناخت ہے۔ پس یہاں سے ہم شناخت کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ پس شناخت کے مسئلے کو واضح کرنا ضروری ہے۔[15]

شناخت کا مفہوم

ہمارے پاس شناخت کے لئے دو مراحل ہیں۔ شناخت ابتدائی، شناخت لفظی، شرح لفظ بھی کہا جاتا ہے۔ دوسرا مرحلہ تفصیلی، تفکر و تدبر کیساتھ عمیق ادراک[16]۔ جسے تعریف بھی کہتے ہیں۔ معرفت بھی اسی طرح ہے۔ ایسا یقین وایمان کہ جو مدلّل اور صادق ہو۔ True Justified Belief۔ لہٰذا معرفت میں ہم اعتماد، اطمینان اور سکون اور یقین کے پیچھے ہیں۔ پس ہماری معرفت لازماً دلیل کی بنیاد پر ہو۔ دلیلِ معتبر کی بنیاد پر۔ یہ مدلّل ہونا، بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ لوگوں کے بہت زیادہ یقین وایمان، منطقی دلیل نہیں رکھتے۔ لوگوں کے بہت زیادہ ایمان ایسے ہیں جو سنی سنائی باتوں پر بنے ہوئے ہیں۔ اجتماعی، سیاسی مسائل میں سب جگہ ایسا ہی ہے۔ آج سوشل

میڈیا ایک ایسی جگہ ہے جو ایسے بے شمار غلط اعتقادات کو لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ ان میں سے اکثر اعتقادات جھوٹ ہیں، اِن کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ جعلی اور من گھڑت ہیں، مبالغہ ہیں یا مغالطہ ہیں۔ بہت زیادہ اعتقادات تقلید کی بنیاد پر ہیں۔ بہت زیادہ ایسے افراد جو اپنے آپ کو اہل فکر سمجھتے ہیں اور روشن فکر کہلاتے ہیں۔ ان سب کے پاس ایسے ہی اعتقادات ہیں۔ معرفت شناسی کے لئے لحاظ سے اِن کے عقیدہ کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ ان کے نظریات مدلّل نہیں ہیں۔ اپنی کوشش کی حد تک ہم اس قابل ہوں کہ اپنی معرفت کو دلیل کے ساتھ بیان کر سکیں۔[17]

تصور بدیہی و تصور نظری۔

وہ مفاہیم جو ذہن میں ہیں، وہ دو گروہ ہیں۔ مفاہیم نظری جن کی تعریف کی ضرورت ہے۔ ایک گروہ مفاہیم و معارف بدیہی ہیں، جنہیں تعریف کی ضرورت نہیں۔ بدیہی یعنی جو لفظ سنیں تو آسانی سے معنی کا پتہ چل جائے۔ مثلاً درخت۔ نظری یعنی فقط لفظ سننے سے معنی درک نہیں کر سکتے۔ معنی سمجھنے کے لئے تفکر و تحقیق کی ضرورت ہے۔ مثلاً لفظ توانائی وغیرہ۔ اس کو توضیح کی ضرورت ہے۔ معرفت مفہوم بدیہی میں سے ہے۔ یعنی معنیٰ معرفت کو سب سمجھتے ہیں۔ یا مترادف کو جانتے ہیں۔ معرفت یعنی شناخت، دانست، دانش، دانائی، آگاہی، علم یہ سب تقریباً معرفت کے مترادف ہیں۔ ہم آگاہ موجودات ہیں۔ معرفت رکھتے ہیں یعنی خود آگاہی۔ جس طرح باہر ہم درخت کی واقعیت کو دیکھ رہے ہوتے ہیں اسی طرح اپنے اندر معرفت کی حقیقت کو دیکھتے ہیں[18]۔ مثلاً ہم جانتے ہیں کہ انسان وجود رکھتا ہے۔ سورج روشنی کا گولہ ہے۔ جھوٹ برا ہے۔ دو اور دو چار ہیں۔ میں ہوں، میں خوش ہوں، میں غمگین ہوں۔ ہم سب یہ سمجھتے ہیں۔ بعض کو ہم بیرونی حواس سے سمجھتے ہیں اور بعض کو اندرونی طریقے سے کشف کرتے ہیں۔ بعض کو تھوڑے سے تفکر سے جانتے ہیں۔ یہ معرفت کے مصادیق ہیں۔ اسی طرح جاننے اور نہ جاننے کے فرق کو سمجھتے ہیں۔ معرفت کے معنی کو سمجھتے ہیں۔ مثلاً بعض چیزوں کو جانتے ہیں کہ اُنہیں نہیں جانتے۔ مثلاً ہم نہیں پتہ کہ باقی سیاروں پر موجودات ہیں یا نہیں۔ یا موجودات باشعور ہیں یا نہیں۔ یا مثلاً انسان ہزار سال پہلے کتنی تعداد میں تھے۔ یا ہزار سال میں ہمارے پاس زمین پر کون سے جاندار ہونگے۔؟ انسان کس حالت میں ہوگا۔؟ پس کچھ چیزیں اور معاملات ہیں جن کے بارے میں ہم جانتے ہیں اور کچھ ہیں جن کے بارے میں ہم نہیں جانتے۔ لہٰذا معرفت کے معنی میں اس فرق کو جان لیتے ہیں کہ ہم کچھ جانتے ہیں اور کچھ نہیں جانتے۔ یہ سب اس بات کی علامت ہے کہ معرفت کو درک کرتے ہیں۔ بہر حال یہ اجمالی ادرک ہے۔ اسے تفصیلی کرنے کے لئے اس میں حد سے بڑھنا ہوگا۔ اس کے درجات ہیں۔ شدت و ضعف ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے ایک حقیقت کے مختلف پہلو ہوں۔ ممکن ہے ہم کچھ پہلوؤں کو جانتے ہوں اور کچھ کو نہیں۔ بعض کو اجمالی جانتے ہیں تفصیلی نہیں جانتے۔

شناخت حضوری اور شناخت حصولی۔

شناخت حضوری شناخت بے واسطہ ہے۔ یعنی عالم اور معلوم میں جدائی نہیں ہے۔ عالم اور معلوم ایک طرح سے یگانگی رکھتے ہیں۔

ایک طرح سے عینیت رکھتے ہیں۔ معلوم اپنے عالم کے نزدیک حاضر ہے۔ علم حصولی وہاں ہے جہاں معلوم عالم کے نزدیک حاضر نہیں ہے اور معلوم کو ایک واسطے سے شناخت کرتے ہیں۔ شناخت حصولی، شناخت مفہومی ہے، شناخت خبری ہے[۱۹]۔ مثلاً اگر ابھی ہم ماضی کے انسانوں کے متعلق بات کریں تو ماضی کے انسان ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ اِس دنیا میں وجود نہیں رکھتے۔ لیکن ہم اُن کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام، فرعون، نوحؑ،، قارون۔ یہ سب ابھی اِس دنیا میں وجود نہیں رکھتے۔ لیکن ہم اِن کے بارے میں ایک طرح کا علم رکھتے ہیں۔ یہ قسم علم حصولی ہے۔[۲۰] منابع معرفت کچھ اس طرح ہیں۔ عقلانی، وحیانی، تجربی، شہودی۔

شناخت ضرورتِ انسان

انسان کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت معرفت ہے، شناسائی رکھنا ہے۔ جب ہم آنکھ کھولتے ہیں تو ہم اپنے آس پاس ماحول کو دیکھتے ہیں۔ ماحول سے رابطہ قائم کرتے ہیں۔ اپنی ضرورتوں کو شناخت کرتے ہیں اور اُن ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ اس سارے عمل میں شناخت اہم ہے۔ ہم میں اور جمادات اور پودوں میں فرق ہے۔ جانوروں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور فقط یہ کہہ سکتے ہیں کہ جانور بھی ایک حد تک شناخت رکھتے ہیں۔ البتہ شناخت کی جہت، دائرہ کار اور گہرائی کا فرق ہے۔ ہماری بحث انسان سے متعلق ہے۔[۲۱]

ہماری شناخت تدریجی ہے۔ ہم ہر چیز کو جسے جاننا چاہتے ہیں، پہلے سے نہیں جانتے ہوتے بلکہ بتدریج جانتے ہیں۔ انسان اس لحاظ سے ایک دوسرے سے فرق کرتے ہیں۔ جو شخص زیادہ کوشش کرتا ہے اور زیادہ صلاحیت رکھتا ہے وہ زیادہ معرفت پالیتا ہے۔ بہر حال ایک حد تک فیلسوفان اور متفکران نے سوالات اور جوابات کے متعلق بحث کی ہے۔ مثلاً یہ سوال کہ ہمارے ادراک کہیں سب خطانہ ہوں۔ کیا محدودیت کی وجہ سے ہم واقعیت کو شناخت کر سکتے ہیں؟ شناخت کی راہیں کون سی ہیں۔؟ کون سی راہ معتبر ہے اور کون سی معتبر نہیں ہے۔؟ حسی معرفت کی قدر و قیمت کتنی ہے۔؟ معرفت عقلی کتنی اہمیت کی حامل ہے۔؟ کیا حس و عقل کے علاوہ معرفت کا کوئی راستہ یا کوئی اوزار ہے۔؟ معرفت دینی، اس جہان کو سمجھنے میں کیا مقام رکھتی ہے۔؟ کیا معرفت عرفانی ممکن ہے اور ہم کیسے پا سکتے ہیں۔؟ اُس کا اعتبار اور جانچ پڑتال کیسے ہو سکتی ہے۔؟ کون سی چیز قابل شناخت ہے اور کون سی چیز قابل شناخت نہیں ہے۔؟ وہ علم جو معرفت کی بحث کرتا ہے معرفت شناسی Epistemology کہلاتا ہے۔ Theory of Knowledge۔[۲۲]

معرفت شناسی میں اہم ترین بحث جو قرون وسطیٰ میں موجود تھی، وہ نسبت عقل وایمان تھی۔ عقل اور وحی کی نسبت کے بارے میں تھی۔ ایک طرف انسان قوہ عاقلہ رکھتا ہے اور دوسری طرف ادیان الٰہی ہیں جو مقدس کتابوں کے ساتھ معتقد ہیں، یہ کتابیں کلام الٰہی ہیں۔ ان میں بیان شدہ حقائق صادق اور یقینی ہیں۔ مسیحیت قرون وسطیٰ میں، متکلمان اور فیلسوفان مسیحی ان دو سنتوں کے وارث تھے۔ سنت دینی جو مسیحی اور ایک سنت عقلی جو یونان سے اُنہیں وراثت میں ملی تھی۔ ڈیکارٹ کی کتابوں اور تاریخ فلسفہ کی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ ڈیکارٹ اپنے تفکر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر ہر چیز پر شک کر بھی لیا جائے، تب بھی اپنے شک پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ میں شک کروں یا نہ کروں، جس پہ یقین کرتا ہوں وہ درست ہو یا نہ ہو، یہ بات لازم ہے کہ میں فکر کر رہا ہوں۔ پس فکر کرنے

سے پتہ چلتا ہے کہ میں موجود ہوں۔ میں فکر کر رہا ہوں لہٰذا میں موجود ہوں۔[۲۳]

قرآنی معرفت شناسی متنوع ہے

قرآنی معرفت شناسی میں معرفت کے تمام راہوں اور تمام روشوں کی تاکید ہوئی ہے۔ قرآن معرفت کے تمام راستوں کو معتبر سمجھتا ہے اور کسی معرفت کو کسی ایک راستے میں منحصر نہیں کرتا۔ البتہ معرفت کے ان تمام راستوں میں ممکن ہے ہم غلطی اور خطا کر بیٹھیں اور یہ البتہ ہماری انسانی طبیعت کا لازمہ ہے۔ ہماری محدودیت خود ان روشوں کے ذریعے ظاہر ہوتی ہے۔ ممکن ہے تجربے یا عقلی روش میں خطا کر بیٹھیں، شناخت عرفانی اور حتیٰ شناخت دینی میں غلطی ہو جائے۔ اِس میں شک نہیں کہ دینی معرفت میں بہت زیادہ غلطیاں ہوئیں ہیں۔ وہ جو معصوم ہیں اور خطا نہیں کرتے، وہ پیغمبر وہ معصوم اور قرآن ہیں۔ جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ممکن ہے کہ ہم تفسیر میں غلطی کر بیٹھیں۔ پس غلطی انسانی محدودیت کا لازمہ ہے۔ پس ہمیں چاہیے کہ ہم کوشش کریں کہ جہاں تک ہو سکے، غلطیوں کو کم کر سکیں اور تصحیح کر سکیں۔ اپنی غلطیوں کو سدھارنے کا ایک اہم ترین راستہ خود معرفت کے راستوں کی طرف توجہ کرنا ہے۔ معارف کی مختلف اقسام کے بارے میں اور اُن کے حساب سے روشوں سے استفادہ کرنے میں تاکہ واقعیت کو سمجھا جا سکے۔ ایک اہم سوال جس کو ہم جاننے کی کوشش کرتے ہیں؛ کیا انسان کی دینی اور اخلاقی تربیت میں فقط معرفت کافی ہے۔؟

کیا صرف معرفت کا ہونا کافی ہے؟

اس بارے میں فلسفی حضرات مختلف آراء رکھتے ہیں۔ سقراط ایک معروف یونانی اہل علم کے طور پر معروف ہے۔ سقراط کی نظر کچھ اس طرح ہے۔ انسانی احساسات، عواطف و غرائز کو علم و دانش کے ذریعے سے شناخت کر کے ہی فضیلت اور اخلاق کے درخت کو ثمر آور کیا جا سکتا ہے۔ افلاطون کے مطابق انسان عقل و دانش کی وجہ سے طغیانی اور سرکش احساسات کو کنٹرول کر سکتا ہے اور فضائل انسانی کو اپنے وجود کا حصہ بنا سکتا ہے۔ اور جوں جوں انسانی عقل کامل تر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کی شناخت و ادارک اور فضائل اخلاقی کی طرف رغبت میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کو ہم کلی طور پر قبول نہیں کر سکتے کہ علم و عقل ہی ہے جو لوگوں کو سرکش غرائز کے کنٹرول کرنے میں ان کی مدد کرتا ہے۔ وہ افراد کہ جن کا علم و عقل سے واسطہ نہیں وہ برے لوگ ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ بافضیلت لوگ اہل عقل و شناخت ہی ہیں۔[۲۴] ہمیں دنیا میں یہ بھی نظر آتا ہے کہ وہ بھی اہل عقل ہی ہیں جو دنیا میں انتشار پھیلاتے ہیں۔ اور بہت سے مفاسد اخلاقی کے بارے میں باقاعدہ کتابیں تحریر کرتے ہیں یا دیگر مفاسد شراب خوری، جنسی آزادی، رشوت، جوا اور دیگر مفاسد کی حمایت میں سیمینارز کا انعقاد کرتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ صرف عقل و شناخت پر اکتفا نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یہی افراد ہوتے جو انسانی حقوق کے نام پر ان کا استحصال کرتے ہیں۔ اور "پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات" پس یہی چیز سامنے آتی ہے کہ صرف علم و عقل غرائز واحساسات اور عواطف کو تبدیل نہیں کر سکتے۔

درست ہے کہ پہچان ایمان کا رکن ہے۔ لیکن کیا صرف پہچان اور سمجھنا ہی ایمان ہے۔؟ نہیں قرآن میں ایمان کا یہ مطلب نہیں ہے۔ ایمان پہچان کیساتھ ساتھ تسلیم بھی ہے۔ ایمان میں میلان و رجحان کا عنصر، تسلیم کا عنصر، خضوع و مہر و محبت کا عنصر بھی رچا بسا

ہوا ہو۔لازم نہیں ہے کہ جو شخص کسی کی پہچان رکھتا ہو اس سے میلان بھی رکھتا ہو۔ ستارہ شناس یا معدن شناس لازمی نہیں ہے کہ وہ ستارے اور معدن سے میلان بھی رکھتے ہو بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان کے دشمن بھی ہوں۔ابو جہل وابو لہب وابو سفیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اچھی طرح پہچانتے تھے لیکن دشمنی بھی انتہا درجے کی رکھتے تھے۔اور قرآن نے بھی اہل کتاب کے بارے میں اسی مطلب میں یوں بیان فرمایا ہے۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس (رسول) کو اسی طرح پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور ان میں سے ایک گروہ جان بوجھ کر حق کو چھپا رہا ہے (۲:۱۴۶)۔اہل کتاب اپنی کتب میں رسول آخر الزمان ﷺ کے تمام اوصاف پڑھ چکے تھے۔ چنانچہ اہل کتاب کا پڑھا لکھا شخص پہلی نظر میں ہی آپ ﷺ کو پہچان لیتا تھا۔ جس طرح اپنی اولاد کو پہچاننے میں انسان کو دشواری نہیں ہوتی۔ کیونکہ اولاد کی پہچان کا تعلق صرف مشاہدات سے نہیں ہوتا، بلکہ قلبی تعلق اور محبت اس پہچان کے اہم عنصر ہیں۔ جن کی وجہ سے باپ دور سے اپنی اولاد کی خوشبو سونگھ لیتا ہے اور بیٹے کی قمیص سے چشم پدر میں روشنی لوٹ آتی ہے۔اسلام میں فقط پہچان کافی نہیں ہے جیسا کہ فلسفی دعویٰ کرتے ہیں۔

اس بات کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نے بہترین پہچاننے والوں کے بہترین نمونے بتلائے ہیں۔اور بہترین پہچاننے والوں کا تعارف یہ کہہ کر کرایا ہے کہ وہ خدا و معاد کو اونچے درجے تک پہچانتے ہیں اور اس کے باوجود پھر بھی کافر ہیں۔ مومن نہیں ہیں وہ کون ہیں؟وہ شیطان ہے دشمن خدا, جس کی پہچان ہم سے کئی گنا زیادہ۔ہزارہا سال عبادت خدا میں بسر کر دیئے،فرشتوں کو پہچانتا ہے،فرشتوں کی صف میں رہا،وہ تمام پیغمبروں اور معاد کو ہم سے بہتر پہچانتا ہے۔اگر صرف پہچان لینا ہی کافی ہوتا شیطان کو پہلا مومن ہونا چاہیے۔ لیکن وہ مومن نہیں ہے۔ قرآن نے ایمان کیساتھ ساتھ عملوا الصالحات کی بھی شرط عائد کی ہے۔اس میں پہچان سے بالاتر ایک چیز وجود رکھتی ہے جو تسلیم اور میلان اور رجحان ہے۔اگر صرف شناخت و پہچان ہی کافی ہوتی تو ہم تاریخ میں بہت سے ایسے افراد دیکھتے ہیں کہ جن کے ہاتھوں میں علم و معرفت کی روشن شمعیں تھیں لیکن کوئی "کمثل الکلب کہلایا تو کوئی کمثل الحمار"۔ پس ہم دیکھتے ہیں اگرچہ تربیت دینی واخلاقی میں تعلیم و شناخت کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے تو ہمیں یہ بھی مد نظر رکھنا ہوگا کہ اس کے علاوہ بھی دیگر عوامل مثلاً رجحان و رغبت، عواطف کی پرورش اور ہدایت، موانع تربیت سے دوری، مربی کا نمونہ کامل ہونا اور متربی کا تزکیہ نفس وہ عوامل ہیں کہ اسے کمال تک پہنچانے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ایک اہم سوال جو توجہ طلب ہے۔رجحان و رغبت کا انسانی کردار و رفتار میں کتنا عمل دخل ہے۔؟

رجحان و رغبت کا مفہوم

"الرّغبۃُ" کے اصل معانی کسی چیز میں وسعت کے ہیں۔ "اَلرَّغَبُ" ارادہ اور خواہش کی رغبت کے لئے بولا جاتا ہے۔جب "رغب" کیساتھ "فیہ" یا "الیہ" بولا جائے تو اس وقت کسی چیز پر" رغبت" اور "حرص" کے معانی میں آتا ہے۔اور اگر "رغب عن" آئے تو اس وقت اسے بے رغبتی کے معانی میں لیا جاتا ہے۔الشھوہ کے معانی نفس کا اس چیز کی طرف کھینچ جانا جسے وہ چاہتا ہے۔خواہشات دنیوی دو قسم پر ہیں صادقہ اور کاذبہ سچی خواہش وہ ہے جس کے حصول کے بغیر بدن کا نظام میں اختلال یا خلل واقع ہو جاتا

ہے جیسے بھوک کے وقت کھانے کی اشتہا وغیرہ اور جھوٹی خواہش وہ جس کے عدم حصول کی صورت میں بدن میں کوئی خرابی پیدا نہیں ہوتی۔[۲۵]

پھر شہوۃ کا لفظ کبھی اس چیز پر بولا جاتا ہے جس کیطرف طبیعت کا میلان اور رجحان ہو اور کبھی خود اس قوت شھویہ پر۔ زُیِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ لوگوں کو ان کی خواہشوں کی چیزیں بڑی زینت دار معلوم ہوتی ہیں۔اس میں دونوں قسم کے خواہشات مراد ہیں اور ''واتبعوا الشهوات'' کہ جس میں خواہشات نفسانی کے پیچھے لگ جانے کی بات ہے۔اس میں مراد وہ جھوٹی خواہشات ہیں کہ جن سے استغنا ہو سکتا ہے۔انسان مادی بدن کے علاوہ ایک دوسری حقیقت بھی رکھتا ہے کہ جسے روح و روان کہتے ہیں۔یہ حقیقت اسے دیگر حیوانات ایک امتیازی حیثیت عطا کرتی ہے۔جب ہم انسان کی اس حقیقت کے بارے تھوڑا غور کرتے ہیں تو ہم دو جہات یعنی جہت ادراکی و جہت میل و رغبت (یا جسے شہوت کا نام بھی دیا جاتا ہے) کا حامل پاتے ہیں۔

انسان کا ایک اہم پہلو یعنی رجحان و رغبت

خداوند متعال انسانی فطرت میں خیر و شر کی رغبت اور رجحان کو رکھا ہے۔اگر یہ میل و رغبت نہ ہو تو "اختیار" بے معنی ہے۔انسانی ارادے اس کی میل و رغبت کے عکاس ہوتے ہیں۔یعنی ہر ارادے کے پیچھے ایک میل و رغبت پنہاں ہے۔شدت شوق ہی تمایل انسانی ہے[۲۶]۔یہ تمایلات کیسے ابھرتے اور وجود میں آتے ہیں۔؟پس ضروری ہے کہ اس بات کو یہاں بیان کیا جائے۔انسان کی اختیاری حرکت کی بنیاد تین عوامل پر ہے۔ میل و رغبت، شناخت و آگاہی، قدرت۔[۲۷]

یہی مثلث انسانی خود مختاری کی زمینہ سازی ہے۔اگر انسان کو ایک گاڑی سے تشبیہ دی جائے تو اس میں حرکت کا اصلی عامل میل و رغبت ہے۔یہی وہ موٹر ہے کہ جو اس وجود کو انرجی فراہم کرتی ہے۔علم و آگاہی وہ چراغ ہیں کہ جو رستے کو روشن و مشخّص کرتے ہیں۔اور قدرت وطاقت اس گاڑی کے ٹائیر اور دیگر پرزہ جات ہیں جو اسے متحرک ہونے میں مدد فراہم کرتے ہیں[۲۸]۔انسانی خواہشات و رجحانات کو مادی و غیر مادی عنوان سے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔وہ خواہشات کہ جن کا نتیجہ بدنی ضروریات کا پورا کرنا ہے جیسے بھوک، پیاس وغیرہ۔ بعض رجحانات کا تعلق انسان کی روحی خواہشات سے وابستہ ہے۔مثلاً خوشی، سکون، اطمینان، حق کی جستجو وغیرہ ۔سوال یہ ہے کہ کونسے محرکات ہیں جو انسانی خواہشات کو ابھارنے کا کام سرانجام دیتے ہیں؟جو نتیجتاً ایک کردار کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

ہر ذی روح میں دو چیزیں بنیادی خصوصیات کے طور پر پائی جاتی ہیں۔ایک ادراک اور دوسری حرکت بالارادہ۔ادراک کی سرزمین علم و شناخت کی سرزمین ہے۔اور ارادہ میں انسان کا تمایل، رغبت اور انگیزہ کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔شناخت اور رجحان و رغبت یہ دو بنیادی عوامل ہیں کہ جس کے کوکھ سے انسان کا عمل ظاہر ہوتا ہے۔اور اسی کو ہم کردار و رفتار کا نام دیتے ہیں۔یعنی شناخت + رغبت و رجحان = عمل و رفتار؛؛پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ اعمال کی بجاآوری میں فقط شناخت کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان جس چیز کو جانتا ہوتا ہے اسی کے برخلاف عمل کرتا ہے۔یعنی وہ معالج کہ جو مریضوں کو سگریٹ نوشی کے نقصانات سے

تو آگاہ کرتا ہے لیکن خود سگریٹ نوشی بھی کرتا ہے۔

یہ بات قطعی ہے کی شناخت کی ہماری زندگی بنیادی تاثیر ہے۔ لیکن فقط تنہا محرک نہیں ہے۔اس کے ساتھ کچھ دیگر عوامل بھی ہیں۔[۲۹] غرائز، عواطف، اور احساسات بھی ایک طرح سے رجحانات کا دوسرا نام ہے۔ عواطف وہ رجحانات ہیں جو دیگر انسانوں سے رابطے کی وجہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ جیسے والدین اور اولاد کا رابطہ اور اسی طرح باہمی عطوفت اور کشش۔ جیسے جیسے یہ اجتماعی، قدرتی اور معنوی روابط مضبوط ہوتے ہیں اس کیساتھ ساتھ عطوفت بھی بڑھتی ہے۔اولاد اور والدین کا رابطہ (طبیعی) قدرتی رابطہ ہے جب کہ استاد اور شاگرد کا رابطہ معنوی بنیادوں پر ہے[۳۰]۔

عواطف ایک قوت محرکہ

شناخت و عواطف، یہ دونوں اس قدر ایک دوسری کیساتھ وابستہ ہیں کہ بعض اوقات باریک بین دانشمندان پر بھی یہ بات مشتبہ ہو جاتی ہے کہ عاطفہ شناخت سے پہلے ہے یا بعد میں یا دونوں ایک ہی ہیں۔؟ (J.Piaget) اس بات کا معتقد ہے کہ شناخت اور عواطف میں بہت زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ان میں سے اگر ایک تبدیل ہوگا تو دوسرے میں بھی تبدیلی آئے گی۔ ہوش کو کام میں لانے کے لیے عواطف کی طاقت محرکہ کو لانا پڑے گا۔ اگر کوئی ایسا کام کہ جس میں انسان کا رجحان و رغبت نہ ہو تو وہ اسے حل کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ رغبت اور عاطفی ہی وہ قوت محرکہ ہے جو اسے آگے لیکر چلتی ہے۔ کسی بھی کام میں رغبت یا اس سے نفرت ۔بہرحال اس کے لئے عواطف ذریعۂ انرجی ہیں۔ ریاضی کے دو طالب علموں کی مثال لیتے ہیں ایک جس کو ریاضی کے مسائل میں دلچسپی ہے لیکن دوسرے کو دلچسپی نہیں ہے۔ پہلا ریاضی کو اچھے طریقے سے حل کرے گا لیکن دوسرا اُسے بوجھ تصور کرے گا اور دامن چھڑوانے کی کوشش کرے گا۔ پس اوّل کے لئے رغبت باعثِ انرجی ہے جبکہ دوسرے کے لیے باعثِ سُستی۔[۳۱] عواطف ہی رجحانات کا پیش خیمہ ہیں کہ جو ایک انسان کو دوسرے انسانوں سے جوڑتے ہیں جیسے بچے کی والدین اور والدین کی بچوں سے اُلفت۔ جوں جوں انسان کے اجتماعی، فطری و معنوی روابط مضبوط ہوتے جائیں گے اس کیساتھ ساتھ عطوفت میں اس قدر اضافہ ہوتا چلا جائیگا۔ والدین و فرزند کے درمیان ایک قدرتی رابطہ عطوفت ہے۔ طالب علم اور استاد کا رشتہ معنویت کی بنیاد پر ہے[۳۲]۔

امام غزالی کے بقول عواطف نفسیات کا بلند ٹیلہ ہے کہ جس نے اپنے اندر بہت سے احساسات کو سمویا ہوا ہے۔ کہتے ہیں انسانیت سے مراد وہ عطوفت ہے کہ جس میں محبت، اخوت، تعاون وغیرہ دیکھا جاسکتا ہے[۳۳]۔ بعض ماہرین نفسیات خوشی و غمی، افسردگی، پسند و ناپسند کو بھی عواطف اور احساسات کے زمرے میں ذکر کرتے ہیں۔ عطوفت اور بے رغبتی کے بارے میں مختلف آراء کو دیکھنے کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ عطوفت کی بنیاد اور سرچشمہ کیا ہے۔؟ کیسے وجود میں آتا ہے؟ کلی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ تمایلات اور رغبت ہی ہیں کہ جو عاطفہ کو بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ عواطف کی تکیہ گاہ وہ محبت اور تعلق ہے یا وہ نفرت اور کراہت ہے کہ جو درد والم اور لذت سے جڑی ہوئی ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جن عوامل سے اسے لذت حاصل ہوتی ہے وہ ان کی طرف راغب ہوتا ہے۔اور وہ عوامل کہ جو رنج والم کا پیش خیمہ ہوتے ہیں ان سے دوری اختیار کرتا ہے۔ محبت اور نفرت کی بنیاد پر عواطف وقوع پذیر ہوتے

ہیں ۳۴۔

عواطف اور شناخت کی ایک دوسرے پر تاثیر

جیسا کہ بیان ہو چکا کہ ارادہ و اختیار کے لئے شناخت و عواطف دو بنیادی عناصر ہیں۔ کوئی بھی ارادی اور اختیاری کام شناخت اور عطوفت کے بغیر پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔ پس مولا علی علیہ السلام کے اس فرمان کے ذیل میں جو آپ نے کمیلؓ سے فرمایا:؛مامنْ حَرَکَۃ الَّا وَانْتَ مُحْتاجٌ فیها الی مَعْرِفَۃ'' کوئی کام بھی ایسا نہیں ہے کہ جس میں آپ معرفت کے محتاج نہیں ہیں۔ ہر عمل کا لازمہ یہ ہے کہ انسان اس کو اچھی طرح جانے اور اسکے بعد عمل کو اچھے انداز میں سرانجام دینے کے لیے میل و رغبت کا ہونا ضروری ہے۔ محبت و الفت بغیر معرفت کے حاصل نہیں ہوتی۔ شناخت و معرفت کی مثال ایک کار کی سی ہے اور عطوفت ایک موٹر کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ معرفت کی روشنی میں منزل کی جانب حرکت کرتی ہے۔ اور اپنی منزل کا تعین کرتی ہے۔ جتنی شناخت مضبوط ہو گی اتنی ہی میل و رغبت و عطوفت بیشتر ہو گی۔ بقول پیاجے شناخت جہت دیتی ہے اور عطوفت اس کام کی تاخیر یا سرعت کا باعث بنتی ہے۔ ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یعنی جدائی ناپذیر ہیں۔ [۳۵]

انسانی کردار و رفتار پر عطوفت کا اثر

انسانی وجود کے اندر مثبت و منفی دو طرح کے احساسات پائے جاتے ہیں۔ جہاں خدا نے انسان کو ہنسنے کی صلاحیت عطا کی ہے اسی نے رونے کی بھی استعداد سے نوازا ہے۔ ایک موقع ہے کہ جہاں ہنستا ہے اور ایک موقع ہے کہ روتا ہے۔ ایک جگہ ایسی ہے کہ جہاں اسے مہربانی، الفت و محبت کا اظہار کرنا ہے۔ اور ایک محل ایسا ہے کہ وہاں غم و غصے کا اظہار واجب ہے۔ یہی وہ خاصیت ہے کہ جسے قرآن اشدَّاءَ علی الکفار و رحماء بینهم کہا ہے۔ یعنی انسانی فطرت میں قوت جاذبہ بھی رکھی ہے اور قوت دافعہ بھی۔ کمال اسی میں ہے کہ اس کے اندر دونوں سرچشمے یعنی تولّی و تبری، محبت و نفرت، خوشی و غمی، ہنسنا اور رونا، رحمت و شدت موجود ہوں اسے معلوم ہو کہ کہاں کس ہتھیار کو استعمال میں لانا ہے۔ پس ضروری ہے کہ انسان افراط و تفریط کا شکار نہ ہو۔ اعتدال کا راستہ بہترین راستہ ہے۔ پس علم و آگاہی کی بدولت ہی انسان قوت جاذبہ و دافعہ کا محلِّ استعمال جان پاتا ہے۔ پس علم و شناخت کا بنیادی کردار ہے جو انسان کی راہنمائی کرتا ہے کہ محبت کہاں ظاہر کرنی ہے اور نفرت کا جگہ کونسی ہے۔ امام غزالی بھی دوسرے مسلمان علماء کی طرح یقین رکھتے ہیں کہ انسان کے کمال میں نفرت کو بھی وہی مقام حاصل ہے جو محبت و الفت کو۔ اگر خداوند متعال انسان کو غضب کی قوت عطا نہ کرتا تو انسانی زندگی غیر محفوظ ہو جاتی اور وہ بہت ساری آفات کا مقابلہ نہ کر پاتا [۳۶]۔

معرفت کا عطوفت پر اثر

انسانی زندگی نشیب و فراز کی حامل ہے۔ بعض لوگوں کے لئے ایک مصیبت ایسی ہوتی ہے۔ وہ اپنا صبر و حوصلے کا دامن چھوڑ دیتے ہیں۔ اور بعض لوگوں کیلئے وہی مصیبت ایک نئی راہ کھلنے کا سبب بنتی ہے۔ ایک بندہ اپنے والدین کو کھونے پر پریشان ہوتا ہے اور اپنی امیدیں کھو دیتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے والدین، اُس کے رزق و روزی کا ذریعہ تھے جو کہ چلے گئے۔ اب جہان ویران ہے۔ ایک دوسرا

شخص ہے جس کا قیامت پر یقینِ کامل ہے۔خدا کو روزی رسان سمجھتا ہے وہ ہمت کرتا ہے اور اپنی قوت بازو اور نصرت الٰہی کے سائے میں اپنی جدو جہد کرتا ہے۔انسان امتحان کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔اگر اسکی زندگی میں مایوسی اور پریشانی غالب آ جائے تو یہ آزمائش اس کے لئے منفی ثابت ہوئی ہے اور اگر اسے قربِ خدا کی منزل پر فائز کرے تو یہ اس کے لئے نعمت ہے اور" وما رأيت الا جميلا" بھی ایسی ہی فکر کی صدا ہے۔احساس، عواطف کے اظہار میں انسان کی جہان بینی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔پس یہاں پر بھی ہمارے لئے واضح ہے کہ عواطف کے لئے شناخت کس قدر اہم ہے۔اگر شناخت وآگاہی ٹھیک ہو تو عواطف کا رد عمل بھی اسی طرح آتا ہے۔اور شناخت و معرفت ہی کج روی کا شکار ہو تو عواطف بھی انحرافی شکل اختیار کر جاتے ہیں[۳۷]۔

عواطف کی فیصلہ جات پر تاثیر

انسانی تفکر پر عواطف کی تاثیر اہلِ علم اور فلسفی حضرات کا موضوعِ بحث رہا ہے۔ڈیکارٹ نے بھی تفکر واحساس کے درمیان رابطے کو بیان کیا ہے۔ویلیام جیمز نے اپنی کتاب بنام "اصل روان شناسی" میں اس کو مورد بحث قرار دیا ہے۔"فشباخ وسینگر" کا اس بات پر یقین ہے کہ جو خود ڈرپوک ہوتے ہیں۔وہ دوسروں کو بھی ڈرپوک تصور کرتے ہیں۔ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اس احساسِ ترس کو ایک اجتماعی خصلت کے طور پر ظاہر کریں۔اسی نظریے کی بنیاد پر افراد کے فیصلوں اور طرفداری کا انحصار ہوتا ہے۔انسانی عواطف پر جب خوشی کا غلبہ ہوتا ہے۔اس کے فیصلوں میں بھی خوشی کا رنگ ٹپکتا ہے۔اگر اس کے عواطف غضب ناک کیفیت میں ہوں تو اس کے فیصلے میں جھول، ناکامی، شکست خوردگی، ناتوانی اور کمزوری نظر آتی ہے۔یہی وجہ ہے اسلام نے غصے کی حالت میں حسّاس فیصلہ جات کرنے سے منع فرمایا ہے۔دونبار (Dunbar. G.C) ولیشمن (۱۹۸۴) (Lishman, W.A) نے منفی عطوفت کے حامل افراد کی فیصلہ سازی اور طرفداری کو دیکھنے کے لئے ایک آزمائش کے مرحلے سے گزارا۔انہوں نے مثبت اور منفی احساسات کے حامل الفاظ، ان افراد کے سامنے رکھے اور شناخت کرنے کو کہا۔افسردہ افراد نے منفی عواطف والے الفاظ کی نسبت زیادہ پہچان کا اظہار کیا۔افسردگی کی شدت میں اضافہ انسانی معلومات اور یادآوری کی قابلیت کو زیادہ تر منفی خیالات وافکار کی طرف لے کر جاتی ہے[۳۸]۔

عطوفت کے منفی اثرات

جس طرح کسی سے محبت اور دل لگی، محب کو اس بات پر مجبور کر دیتی ہے کہ وہ محبوب کے رنگ میں رنگ جائے۔اتنا عاشق ہو جائے کہ فدا ہونے پر آمادہ نظر آئے۔درگزر اور ایثار و فداکاری کے جذبے سے سرشار نظر آئے۔یہی چیزیں بعض اوقات انسان کے لئے حجاب بن جاتی ہیں۔حقائق دھندلا جاتے ہیں۔عیوب او جھل ہو جاتے ہیں۔انسان کمزوریوں کو اچھائیاں سمجھنے لگتا ہے۔ پیامبر اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ) کا فرمان ہے"حُبّ الشيَی يعمی و يصم"[۳۹] حد سے بڑھ کر چاہنا انسان کو اندھا اور بہرہ بنا دیتا ہے۔ قال علی علیہ السلام: « مَنْ عَشِقَ شَيئاً اعشى بَصَرَهُ وامْرَضَ قَلْبَهُ فَهُوَ ينْظُرُ بِعينٍ غَيرِ صَحيحَةٍ وَيسْمَعُ بِاذُنٍ غَيرِ سَميعَةٍ» جو شخص کسی شے سے بے تحاشا محبت کرتا ہے، تو وہ اس کی انکھوں کو اندھا، دل کو مریض کر دیتی ہے۔وہ دیکھتا ہے تو بیمار انکھوں سے سنتا ہے تو نہ سننے والے کانوں سے۔[۴۰]یہی محبت تعصّب کا پیش خیمہ بنتی ہے۔اور اسی طرح پارٹی بازی اور گروپ تشکیل پاتے ہیں۔انسان

معلومات کو حقائق کی بنیاد پر نہیں پر کھتا بلکہ اپنی پسند ناپسند کو بنیاد قرار دیتا ہے۔اسی رنگ میں تجزیہ و تحلیل کرتا ہے۔اسی لئے کہا جاتا ہے کچھ شہوتیں ایک لمحے کے لئے ہوتی ہیں لیکن اس کے غم طویل ہوتے ہیں۔

شناخت، عواطف اور انفرادی اختلافات

انسانی وجود میں دو بُعد اثر رکھتے ہیں۔ایک بعد عقلانی،اور دوسرا عاطفی۔ لیکن تمام انسان ان کو یکساں استعمال نہیں کرتے۔ بعض افراد میں عقلانی پہلو غالب ہوتا ہے اور بعض میں عاطفی۔ان میں سے جو غالب ہو گا وہی اپنے اثرات ظاہر کرے گا۔وظایف کا تعین کرتے ہوئے بھی اس پہلو کو سامنے رکھا جاتا ہے۔مثلاً خانوادہ میں اختلاف کے وقت نو مولود بچے کی دیکھ بھال اور پرورش کے لئے ماں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کیونکہ بچے کی خوراک کا ذریعہ ماں ہے۔اس عمر میں عطوفت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔اس عمر کو باپ اس ذمہ داری کو اچھے طریقے سے سر انجام نہیں دے سکتا۔ہر انسان عقل و عواطف سے مختلف انداز میں استفادہ کرتا ہے۔

ہر انسان میں دو طرح کا شعور موجود ہے۔وہ شعور جس کی بنیاد عقل ہے یعنی شعورِ عقلانی۔دوسرا شعور کہ جو انسانی عواطف پر استوار ہے یعنی شعور عاطفی۔ان کا استعمال اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات بھی فرق رکھتا ہے۔دل عواطف کا مرکز ہے جبکہ عقل معرفت و شناخت کا مرکز۔جب بھی انسان کسی بحرانی صورت حال سے دوچار ہوتا ہے۔وہاں انسانی عواطف،عقلانیت پر غالب آجاتے ہیں۔ہمیشہ احساسات، عقل پر اور قلب،ذہن پر برتری حاصل کرلیتا ہے۔ عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی۔مثلاًاپنے بچے کو بچانے کے ماں یا باپ کا آگ یا پانی میں چھلانگ لگادینا۔ابتداءِ عمر میں چونکہ بچے کو عطوفت زیادہ چاہئے ہوتی ہے اسی لئے ماں کو ترجیح حاصل ہے۔یہی وجہ ہے کہ مردوں اور خواتین کے امور کا مختلف ہونا ایک فطری امر ہے۔ سخت کاموں کی ذمہ داری خواتین کے کندھوں سے اٹھالی گئی ہے۔ گھر اور گھریلو امور کہ جو عطوفت کا مرکز ہے ،اسے خواتین کے سپرد کیا گیا ہے۔ شعور عقلانی و عاطفی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ مکمل طور پر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں۔دونوں ایک دوسرے کو اعتدال میں رکھتے ہیں[۱۴]۔

نتیجہ

جو کچھ بیان ہو چکااس کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فطرتِ انسانی میں چند چیزیں موجود ہیں۔

- اپنا اور دنیا کا ادراک
- جذبات،احساسات، عواطف، میلانات ورجحانات

انسان ہمیشہ حقیقت کی تلاش میں ہے۔یہ جستجو انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ حقائقِ ہستی کو درک کرے۔اس کے لئے بنیادی طور پر تین عوامل رجحان ورغبت، شناخت وآگاہی اور قدرت نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ ہر ذی روح میں دو چیزیں بنیادی خصوصیات کے طور پر پائی جاتی ہیں۔ایک ادراک اور دوسری حرکت بالارادہ۔ ادراک کی سرزمین علم و شناخت کی سرزمین ہے۔ ارادہ میں انسان کا رُجحان، رغبت اور شدتِ شوق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔شناخت اور میل و رغبت یہ دو بنیادی عوامل ہیں کہ جس کے کوکھ سے انسان کا عمل ظاہر ہوتا ہے۔اور اسی کو ہم کردار و رفتار کا نام دیتے ہیں۔یعنی شناخت + رغبت ورجحان = عمل و رفتار ;;انسانی عمل میں

شناخت اور رجحان و رغبت کا کردار تعاملی ہے۔یعنی ایک دوسرے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں دونوں ایک دوسرے کے عامل ہیں ۔پس ہمارے سامنے نتیجے کے طور پر یہ تین صورتیں سامنے آئیں ہیں۔

پس اس ترتیب سے ان کے درمیان تعاملی صورت حال ہے۔اتنے متصل ہیں کہ جدائی ممکن نہیں ہے۔انسان کی تربیت اخلاقی میں ابتدائی مرحلہ شناخت کا مرحلہ ہے، پھر رجحان ور غبت۔رجحان و رغبت کے ساتھ ساتھ احساسات و عواطف انسانی افعال کا اہم محرک بنتے ہیں۔کوئی بھی ارادی اور اختیاری کام شناخت اور رجحان ور غبت کے بغیر پایہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا۔

*****

حوالہ جات

۱. ۱۔مصباح یزدی، محمد تقی، فلسفہ تعلیم وتربیت اسلامی، (تہران،انتشارات مؤسسہ فرہنگی مدرسہ برہان (انتشاراتِ مدرس)۱۳۹۰ش، ۳۴۳۔
۲. ۲۔شریف، سید رضی، نہج البلاغہ، ترجمہ : مفتی جعفر حسین، مکتوب۳۱،المعراج کمپنی لاہور، ۲۰۰۳عیسوی،۶۰۱۔
۳. ۱۔ محمد تقی، مصباح یزدی، فلسفہ تعلیم وتربیت اسلامی، ۳۴۴۔
۴. ۱۔ایضاً، ۳۴۴۔
۵. ۱۔ محمد تقی، مصباح یزدی، اخلاق در قرآن، ج۱، (قم،انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ،۱۳۹۸ش) ۲۵،۱۵۔
۶. ۱۔ محمد تقی، مصباح یزدی، بہ سوی خود سازی، (قم،انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ،چاپ ۴، ۱۳۸۴ش) ۔۷۸،۵۸
۷. ۱۔ محمد تقی، مصباح یزدی، خود شناسی برای خود سازی(قم،انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ،۱۳۸۲ش) ۱۱۰۔
۸. ۱۔شیخ عباس قمی، سفینۃالبحار، جلد۱، ۱۵، سن ندارد
۹. ۱۔ مرتضٰی، مطہری، مسئلہ شناخت،انتشاراتِ صدرا، قم،۱۳۶۸ش، ۱۶۔
۱۰. ۱۔ محمد تقی، مصباح یزدی، فلسفہ تعلیم وتربیت اسلامی، ۱۶۷،۱۶۴۔
۱۱. ۱۔ محمد تقی، مصباح یزدی، بہ سوی خود سازی، ۵۹۔
۱۲. ۱۔ راغب،اصفہانی، مفردات القرآن، ج۱،ترجمہ مولانا عبدہ فیروزپوری،لاہور، ناشر : شیخ شمس الحق،،۱۳۹۰ھج، ۳۴۱
۱۳. ۱ ۔ناصر مکارم، شیرازی، تفسیر نمونہ، ج۱۴،ترجمہ؛سید صفدر حسین نجفی، (لاہور مصباح القرآن ٹرسٹ، معراج دین پرنٹرز،۱۴۱۷ھج، ۱۴۷۔
۱۴. ۱ ۔مجتبیٰ مصباح، فلسفہ اخلاق : مبانی اندیشہ اسلامی ۴، قم،انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ،۱۳۹۸ش) ۲۳۔
۱۵. ۱۔ راغب،اصفہانی، مفردات القرآن، ج۱،ترجمہ مولانا عبدہ فیروزپوری، ۳۹۷۔
۱۶. ۱۔ محمد تقی، مصباح یزدی، فلسفہ تعلیم وتربیت اسلامی، ۳۰۔
۱۷. ۱۔ مرتضٰی، مطہری، مسئلہ شناخت، ۱۶۔
۱۸. ۱۔ محمد بن مکرم، ابنِ منظور، لسان العرب، داراحیاء التراث العربی، لبنان، بیروت، ۱۴۰۸ق، ۱۵۳۔
۱۹. ۱۔ محمد تقی، مصباح یزدی، آموزش فلسفہ، قم،انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ،۱۳۹۸ش، ۱۵۶
۲۰. ۱۔ایضاً، ۱۸۸،۱۷۵
۲۱. ۱۔ مرتضٰی، مطہری، اصول فلسفہ وروشِ رئالیسم، ج۲،انتشارات صدرا، قم،۱۳۹۰ش، ۴۴۔
۲۲. ۱۔ محمد تقی، مصباح یزدی، معارف قرآن ۱، خدا شناسی، قم،انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ،۱۳۹۸ش، ۴۶۔
۲۳. ا۔ محمد بہشتی، مبانی تربیت از دیدگاہِ قرآن، سازمان انتشارات پژوہشگاہ فرہنگ واندیشہ اسلامی، تہران، ۱۳۸۶ش، ۳۰۹۔
۲۴. ۱۔ محمد تقی، مصباح یزدی، آموزش فلسفہ، ج۱، ۱۴۷۔
۲۵. ۱۔ مرتضٰی، مطہری، مسئلہ شناخت، ۲۶۔
۲۶. ۱۔ محمد بہشتی، مبانی تربیت از دیدگاہِ قرآن، ۳۴۶۔

۲۷. ا۔ زینب، کبیری، مبانی و شیوه های تربیت اخلاقی در قرآن، انتشارات زینا، قم، ۱۳۹۱ش، ۱۷۰تا۱۷۳

۲۸. ا۔ مطہری، مرتضیٰ، استفادہ از انسان کامل، انتشارات صدرا، قم، ۱۳۹۰ش، ۱۳۳تا۱۳۶

۲۹. ۱۔ محسن علی نجفی، بلاغ القرآن، ، معراج دین پرنٹنگ پریس، لاہور، چاپ ۲۰۰۷، ۳۵۔

۳۰. ۱۔ مصباح یزدی، محمد تقی، اخلاق در قرآن، ج ۱، ۱۵۶۔

۳۱. ۱۔ راغب، اصفہانی، مفردات القرآن، ، ترجمہ مولانا عبدہ فیروزپوری، ج ۱، ۴۲۹،۔

۳۲. ۱۔ ایضاً، ۵۸۸۔

۳۳. ۱۔ محمد تقی، مصباح یزدی، معارف قرآن، انسان شناسی، قم، انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، ۱۳۹۸ش، ج ۳، ۴۱۲۔

۳۴. ۱۔ ایضاً، ۴۲۵، ۴۲۰۔

۳۵. ۱۔ ایضاً

۳۶. ۱۔ محمد تقی، مصباح یزدی، آذرخشی دیگر از آسمان کربلا، ، قم، انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، ۱۳۸۲ش، (۱۷و۱۸)۔؛ محمود، رجبی، انسان شناسی، قم، انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، ۱۳۹۸ش

۳۷. ۱۔ محمد تقی، مصباح یزدی، بہ سویِ خودسازی، ۶۰

۳۸. ا۔ محمد باقر، حجتی، روان شناسی از دیدگاہ غزالی و دانشمندان اسلامی، ج ۲، ۱۳۶۷ش، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران ، ۱۴۱

۳۹. ۱۔ محمد تقی، مصباح یزدی، معارف قرآن، جلد ۳، انسان شناسی، ۴۱۳

۴۰. ۱ ۔ محمود علیلو، مجید، بررسی آزمائشی اثر خُلق بر حافظہ، پایان نامہ کارشناسی ارشد، ۱۳۷۳ش، انستیتو روان پزشکی، دانشگاہ تہران، ۱۸

۴۱. ا۔ منصور، محمود، دیدگاہ پیاژہ در گسترہ تحول روانی، مؤسسہ انتشارات بعثت، تہران، ۱۳۹۱ش، ۱۴۷

۴۲. ۱ ۔ مصباح یزدی، محمد تقی، استفادہ از آذرخشی دیگر از آسمان کربلا، ، ۱۷

۴۳. ۱۔ ایضاً (۲۵، ۲۴)

۴۴. ۱۔ مصباح یزدی، محمد تقی، انسان سازی در قرآن، قم، انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، ۱۳۹۸ش، ۲۸۱۔

٤٥. 1.G.C Dunbar, and W.A. Lishman, Depression, recognition, memory and hedonic tone .A signal detection analysis. British journal of Psychiatry, (1984). https://doi.org/١٠,١١٩٢/bjp.١٤٤,٤,٣٧٦

۴۶. ۱۔ابو جعفر محمد ابن علی(شیخ صدوق) من لایحضرہ الفقیہ، قم، جامعہ مدرسین، چاپ دوم، ج ۴، ، حدیث ۵۸۱۲، ۳۸۰۔

٤٧. ۱۔ سید شریف، رضی، نہج البلاغہ، ترجمہ: مفتی جعفر حسین، خطبہ ۱۰۷، ۲۷۳۔

کتابیات

۱. مطہری، مرتضیٰ، مسئلہ شناخت، قم، انتشاراتِ صدرا، ۱۳۶۸ش

۲. مصباح یزدی، محمد تقی، فلسفہ تعلیم وتربیت اسلامی، تہران، انتشارات مؤسسہ فرہنگی مدرسہ برہان (انتشاراتِ مدرس) ۱۳۹۰ش

۳. مصباح یزدی، محمد تقی، معارف قرآن، انسان شناسی، قم، انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، ۱۳۹۱ش

۴. مصباح یزدی، محمد تقی، استفادہ از آذرخشی دیگر از آسمان کربلا، قم، مرکز انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، ۱۳۸۲ش

۵. حجتی محمد باقر، روان شناسی از دیدگاہ غزالی و دانشمندان اسلامی، دفتر نشر فرہنگ اسلامی، تہران، ۱۳۶۷ش

۶. مجید، محمود علیلو، بررسی آزمائشی اثر خُلق بر حافظہ، پایان نامہ کارشناسی ارشد، ۱۳۷۳ش، انستیتو روان پزشکی، دانشگاہ تہران

۷. محمود، منصور، دیدگاہ پیاژہ در گسترہ تحول روانی، مؤسسہ انتشارت بعثت، تہران، ۱۳۹۱

۸. مصباح یزدی، محمد تقی، استفادہ از انسان سازی در قرآن، قم، انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، تہران، ۱۳۹۸ش

۹. بہشتی، محمد، مبانی تربیت از دیدگاہِ قرآن، سازمان انتشارات پژوہشگاہ فرہنگ و اندیشہ اسلامی، تہران، ۱۳۸۶ش

۱۰. اصفہانی، راغب، مفردات القرآن، ، ترجمہ مولانا عبدہ فیروزپوری، لاہور، ناشر: شیخ شمس الحق اردو بازار لاہور، ۱۳۹۰ھج

۱۱. مطہری، مرتضیٰ، اصول فلسفہ وروشِ رئالیسم، انتشارات صدرا، قم، ۱۳۹۰ش

۱۲. مصباح یزدی، محمد تقی، معارف قرآن ا، خدا شناسی، قم، انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، ۱۳۹۱ش

۱۳. مصباح یزدی، محمد تقی، آموزش فلسفہ، قم، انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، ۱۳۹۸ش

۱۴. اشکوری, فنّای, معرفت شناسی دینی، طہران، انتشارات برگ، ۱۳۷۴ش

۱۵. ابنِ منظور، محمد بن مکرم، لسان العرب، داراحیاء التراث العربی، لبنان، بیروت، ۱۴۰۸ق

۱۶. کبیری، زینب، مبانی وشیوہ ھای تربیت اخلاقی در قرآن، انتشارات زینا، قم، ۱۳۹۱ش

۱۷. مصباح یزدی، محمد تقی، بہ سویِ خود سازی، قم، انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، ۱۳۸۴ش

۱۸. شیرازی، ناصر مکارم، تفسیر نمونہ، ج ۱۴، ترجمہ؛ سید صفدر حسین نجفی، (لاہور مصباح القرآن ٹرسٹ، معراج دین پرنٹرز، ۱۴۱۷ھج

۱۹. مجتبیٰ، مصباح، فلسفہ اخلاق، مبانی اندیشہ اسلامی ۴، قم، انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، ۱۳۹۸ش

۲۰. مصباح یزدی، محمد تقی، اخلاق در قرآن، قم، انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، ۱۳۹۸ش

۲۱. مطہری، مرتضیٰ، انسان کامل، انتشارات صدرا، قم، ۱۳۹۰ش

۲۲. گلمن، دانیل، ہوش عاطفی و نقش حیاتی آن، ترجمہ حمید رضا بلوچ، تہران، انتشارات اژدھای طلائی، ۱۳۸۹ش

۲۳. رضی، سید شریف، نہج البلاغہ، ترجمہ: مفتی جعفر حسین، المعراج کمپنی لاہور، ۲۰۰۳عیسوی

۲٤. رجبی، محمود، انسان شناسی، قم، انتشارات مؤسسہ آموزشی وپژوہشی امام خمینیؒ، ۱۳۹۸ش

۲٥. Dunbar, G. C. and Lishman. W.A.: Depression, recognition, memory and hedonic tone .A signal detection analysis. British journal of Psychiatry, (1984).). https://doi.org/10.1192/bjp.144.4.376